اردو شاعری میں تلمیحاتی عناصر

صفیر صدف

ABSTRACT:

To limit the language to mere a conglomeration of words is not sufficient rather to call it the specific words which sustain cultural and civilizational bond with its society.

As Language, through poetry, carries more potentialities to create and infuse lasting impact, that is why, minute attributes of language emerge out more prominently. Poetry cannot be judged by doing away with civilization. The poetic roots of urdu language, which come in the category of "Talmeehat", are deep-rooted in its history and civilization. The Term "Talmeehat" is a part of human awareness which has its own civilizational symbols. Talmeehat involves time and space like vastness. An innovative world of modern trends in urdu poetry is witnessed at the end of classical phase and at the beginning of the twentieth century. Urdu Poetry remained progressive towards its heights. Accepting historical incidents as key source, novel meanings and possibilities have been sought. That is why, poets have given them the shape of symbols and Talmeeh and very aptly, so made them the part of poetical experiences.

زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایسے الفاظ کا مجموعہ ہے جو اپنے معاشرے سے ثقافتی و تہذیبی رشتہ استوار کرتے ہیں۔ زبان کے ارتقا کے لیے ہم کسی بھی زبان کے الفاظ اٹھا کر اپنی فعالی حیثیت میں اپنا نہیں سکتے۔ ہمیشہ وہی الفاظ کسی زبان میں اپنی جگہ بناتے ہیں جو ثقافتی پس منظر میں ملتے جلتے ہوں۔ زبان کی ترتیب کا ایک پہلو یہ

ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ سمٹتی جاتی ہے اس لیے نئے الفاظ اُس کے لیے تازہ خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چوں کہ شاعری میں زبان زیادہ اثرات نفوذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لیے زبان کے محاسن لطیف ترین صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں شاعری کا حلقہ بے حد وسیع ہے شاید یہی وجہ ہے کہ محاسنِ شعری کو نہایت تفصیل کے ساتھ دریافت کیا گیا ہے۔ وہ چاہے تشبیہ، استعارہ، محاورہ، رمز، کنایہ، تلازمہ، اصطلاح اور اشارہ ہو ایسے موضوعات کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مولوی نجم الغنی رام پوری کی ''بحرالفصاحت'' کو اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ الغرض محاسنِ شعر میں سے ایک تلمیح ہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے تلمیح کو نہایت خوبی سے اس طرح بیان کیا ہے:

''تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے نشان ہیں جن پر پیچھے چل کر اپنے باپ دادا کے خیالات، مرغومات، اوہام، رسم و رواج اور واقعات و حالات کے سراغ لگا سکتے ہیں۔'' (۱)

تلمیح کا ہماری زندگی میں کیا عمل دخل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے مذہبی نظریات کا بیش تر حصہ تلمیحات کی صورت ہی میں ہمارے حافظے میں موجود ہوتا ہے۔ اسلامی تلمیحات میں حضرت آدم اور حضرت حوا کے حوالے سے شجرِ ممنوعہ کی تلمیح۔ ساتویں آسمان پر شجرِ طوبیٰ ہمارے لیے مقدس درخت ہے جب کہ زمین پر زیتون کا درخت۔ ہندوؤں کے ہاں خالقِ کائنات نے دنیا کو درخت سے بنایا ہے۔ ہندو دیومالا میں ایک درخت کی شاخوں پر بارہ سورج دکھائے جاتے ہیں جو سال کے بارہ مہینوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔(۲) ہندوؤں کے ہاں برگد اور پیپل کے درختوں اور تلسی کے پودے کو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ اہلِ مصر کے ہاں اُزریس دیوتا درخت کے کھوکھلے تنے میں دفن ہوا تب جا کر اُسے نئی زندگی ملی۔ مصر ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں لکڑی کے صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب بھی درخت کے تنے کی نمایندہ ہے۔

الغرض دنیا بھر کی تلمیحات میں کچھ مشترکہ علامات اور ملتے جلتے واقعات کا بیان پایا جاتا ہے۔ اژدہے یا سانپ کی علامت کو دیکھیں تو یہ جانور چینی، ہندی، ایرانی، مصری، عراقی اور اسلامی تلمیحات کا حصہ نظر آتا ہے۔ سانپ وشنو کے گلے کا ہار، اس کی کنڈلی، اس کی سواری اور اس کے ہاتھ کا اشوک چکر ہے۔ بائبل کی رُو سے سانپ آدم اور حوّا کی کہانی میں بھی موجود ہے۔ مصری تہذیب میں تو سانپ، بلی، عقاب اور بیل کے سروں والے انسان ان کے دیوتا ہیں۔

بیل اور گائے کی علامت بہت سی تہذیبوں کا حصہ ہے۔ ایک تو ثورِ فلک کو ذہن میں رکھیے اور دوسرے وہ گائے یا بیل جس نے اپنے سینگوں پر دنیا کو اُٹھا رکھا ہے۔ یونانی اور ایرانی تو بیل کی قربانی دیا کرتے تھے تاکہ فصل اچھی ہو۔(۴) پھر اسی بیل کو اس نے ہل چلانے کے لیے استعمال کیا۔ ہڑپا اور موہنجوڈارو کی کھدائی سے جو مٹی کی مہریں ملی تھیں۔ ان پر بیل کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مجید امجد کی نظم ''کنواں'' کے علاوہ ''ہڑپے کا کتبہ'' میں بھی بیل کا تذکرہ ہے جس میں انسان کی کم مائیگی کا بیان ہے۔

کون مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں ایسے اُس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں تین بیل ہیں دیکھ

(ہڑپے کا کتبہ)(۵)

اہلِ مصر کے ہاں بیل کے سر والے دیوتا کا تذکرہ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں فرعون بھی اپنے خواب میں سات موٹی اور سات دبلی گائیں دیکھتا ہے۔ جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام بتاتے ہیں اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد بنی اسرائیل نے گائے کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی۔

ادب میں تلمیحات کا استعمال دراصل اپنی ہی اصل کی کھوج ہے۔ اپنی تلاش ہی کا سفر ہے۔ معانی کی نئی دنیاؤں کی دریافت ہے۔ بیسویں صدی نے انسان کو جس قدر بے توقیر کیا ہے، اسی قدر اس نے علامات اور تلمیحات کی دنیا سے ناتا جوڑا ہے۔ کبھی ان تلمیحات کو علمِ بشریات اور کبھی علمِ نفسیات کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی اسے تاریخ کے اوراق اور کبھی تہذیبی حوالوں میں تلاش کیا گیا ہے۔ کبھی ان تلمیحات کو داستانوں، افسانوں اور کبھی شاعری کا حصہ بنا کر ان کی مدد سے ادیبوں نے بہت کچھ کہنا چاہا ہے اور اسی تلاش میں بہت کچھ دریافت بھی کیا ہے۔

تلمیحات کی انھی توجیہات نے انھیں ادب کا حصہ بنایا۔ ان قدیم حوالوں کی تفہیم کو آسان بنایا۔ چناں چہ ادب میں ان کی سمائی سے رموز و علائم کی مخفی صورتیں نمایاں ہونے لگیں۔ کلاسیکی ادب اور بعد کی اردو ادب کی تحریکوں میں بھی تلمیحات کا استعمال واضح نظر آنے لگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علم کلام اور معنی و بیان کی مملکت میں تلمیح کا سکہ انسانی تہذیب و ترقی اور علم و فن کی ایجاد سے ہزارہا سال پیش تر سے رائج ہے اور مورخوں سے بھی پہلے اس نے تاریخی واقعات، قصص اور افسانوں کی تدوین شروع کر دی تھی۔

اہلِ ادب کی اصطلاح میں تلمیح کا مفہوم یہ ہے کہ نظم یا نثر میں اشارے کے طور پر کسی افسانے، قصے یا واقعے اور احادیث و آیات کا اجمالاً اس طرح ذکر کیا جائے کہ بغیر اس کی تفہیم کے کلام کا لطف نہ حاصل ہو سکے۔ کلام میں مختصراً جو ایک لفظ کسی واقعے یا قصے کی طرف اشارے کے لیے رکھ دیے جاتے ہیں جس سے ذہن فوری طور پر کسی واقعہ کے جزو یا کل کی طرف دوڑ جاتا ہے۔ اس لیے اس کا نام تلمیح رکھا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف اُچٹتی نگاہ ڈالنا۔(۶)

مجتہدینِ علم کلام نے تلمیح کی دو بڑی قسمیں قرار دی ہیں ا۔ تاریخ قصص اور معتقدات، ۲۔ تاریخ و قصص، اسماء اعلام سے متعلق خاص واقعات مخصوص تاریخی باتیں اور آثار۔

کسی نے تختِ سلیمان پر جگہ پائی
کسی نے خاک نشینوں میں اپنا نام کیا ؎

ایک یوسف ہوں ظفر اور برادر اتنے
نیت اب کیا کہوں میں ان کی بھلا کیسی ہے ۸

مندرجہ بالا اشعار یوسف کی بے جرم سزا، تختِ سلیمان اور برادران یوسف کے مرکب الفاظ ان شخصیات سے متعلق مخصوص واقعہ اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ معتقدات میں وہ باتیں شامل ہیں جن کو مذہبی عقیدے کے طور پر جانا جاتا ہے جیسے:

مجھے کر دو غریقِ حوضِ کوثر
خرابِ بادۂ انگور ہوں میں ۹

اس شعر میں آبِ کوثر کا حوض صرف عقیدہ کے متعلق ہے۔

اردو شاعری اپنے آغاز ہی سے تسلسل سے اپنی ترقی کی طرف گامزن رہی ہے۔ کلاسیکی دور سے علی گڑھ تحریک اور پھر رومانی تحریک سے ترقی پسند تحریک کا سفر کرتے کرتے ۱۹۴۷ء کی تقسیمِ پاک و ہند سامنے آ گئی۔ اس تقسیم نے تاریخی، جغرافیائی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور ادبی سطح پر تموج کے آثار پیدا کر دیے اور فسادات کے ساتھ ساتھ ہجرت کے تجربے نے المیہ دوگنا کر دیا۔ ہجرت کے اس سانحہ نے جذبے اور تفکر کی لہروں کو متاثر کیا اور ادب کی نئی توجیہہ، نئی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی۔

''تو گویا یہ نئے لکھنے والے کھوئی ہوئی روح کو ڈھونڈتے ہیں۔ قدیم اصنافِ سخن متروک الفاظ، گم شدہ لہجے رد کیے ہوئے اسالیب بیان۔ یہ سارا کھڑاک، اس لیے پھیلایا گیا ہے کہ کوئی شے گم ہو گئی ہے اور اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ کچھ کھو جانے اور اس کی وجہ سے غریب ہو جانے اور ادھورا رہ جانے کا احساس شاید آج کی غزل کا بنیادی احساس ہے۔ اس احساس نے غزل میں تو بالعموم عشق کے استعاروں میں اظہار کیا ہے مگر نظم اور اردو افسانے میں عشق کے سوا بھی استعارے استعمال ہوئے اور بات تاریخ اور دیومالا تک گئی۔ سن ستاون، الجزایر، قدیم ہند کی قصص و روایات، گویا ان نشانات سے اپنے آپ کو پانے کی، مختلف زمانوں اور زمینوں میں اپنے رشتے تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔۔۔ رشتوں کی تلاش ایک درد بھرا عمل ہے مگر ہمارے زمانے میں شاید وہ زیادہ ہی پیچیدہ اور درد بھرا ہو گیا ہے۔ مولانا حالی اور ان کے بعد علامہ اقبال نے مسلمانوں کی تاریخ کو پورا حوالہ جانا اور اس بنیاد پر ماضی سے رشتہ قائم کیا۔ ان کے بعد میرا جی آئے جنھوں نے یہ کہہ جان چھڑائی کہ میں تو آریائی ہوں اور ہندو دیومالا میں اپنی جڑیں تلاش کیں۔'' (۱۰)

بیسویں صدی تک آتے آتے اردو نظم نے کئی انداز بدلے۔ نظم نے اپنی روایتی کلاسیکی ہیئتوں سے ہٹ کر جدید ہیئتوں کو اختیار کیا۔ چناں چہ شعرا نے پابند نظم کے علاوہ آزاد نظم اور نظمِ معریٰ جیسی منفرد ہیئتوں کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ جدید نظم زیادہ تر علامتی انداز کی حامل ہے۔ علاوہ ازیں جدید نظم نے اس خطے کی تہذیبی اور تاریخی تبدیلیوں کا

بھی خیر مقدم کیا اور انھیں اپنا کر موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر اپنا کینوس وسیع کیا۔ راشد، میراجی، مجید امجد اور ان کے ہم عصر دوسرے شعرا کی آزاد نظم نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ اس تبدیلی کو ۱۹۷۰ء کے بعد شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب شعرا نے ایک ہی نظم میں متعدد علامات و تلمیحات یک جا کر دیں۔ مثال کے طور پر جعفر طاہر کی یہ نظم دیکھی جا سکتی ہے:

رہینِ آبِ زلالِ خضر و دمِ مسیحا

- - -

اور اس میں آدم کا گاہوارہ

جہیز ہوّا

سفینۂ نوح، نادِ منو

ہوائے گلخانۂ براہیم، یہ عصائے کلیم

یہ چنگِ پاک داؤد ہے تو یہ بربطِ سلیمان

وہ کرشن کی بنسری دھری ہے

وہ رام کے نام ہے مالا

قنات اندر قنات گم سوزنِ کلاکار آسیا

فرخوابِ سلطانیِ زلیخا

یہ میرا خیمہ کہ حسنِ یوسف چراغ جس کا

جمالِ گوتم کی دلبرانہ خموشیاں حرفِ مجرمانہ

صدائے سقراط، سوزِ زرتشت، ہاؤ ہوئے قلندرانہ

اسکندر و سازِ علمِ یوناں

دمِ مسیح و جلالِ روما

- - - - -

حبیبِ یزداں محمد مصطفٰے علیہ اسلام

بھی ہیں قیام فرما

- - - -

مگر یہ نقش و نگارِ خونِ حسین و لبِ تشنگانِ میدانِ کربلا کے لہو سے رخشاں

- - -

ذوالفقارِ علی و ملکِ عطارد و برقِ طورِ یکجا

نوائے مانی و فکرِ مولائے روم

حلاج و سرمد و طاہرہ کا سوزِ حدوں

(حدیث دلبراں)(۱۱)

مندرجہ بالا نظم کے ٹکڑوں میں بیک وقت حضرت آدم، حضرت حوّا سے لے کر حلاج، سرمد اور طاہرہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

اردو غزل ہو یا نظم یہ بات تو طے ہے کہ بیسوی صدی کے متنوع اور ہنگامہ پرور واقعات کا ان اصناف نے لازمی اثر قبول کیا ہے۔ غزل اپنی مخصوص ہیت کے ساتھ موضوعات کا تنوع لے کر آئی جب کہ نظم نے موضوعاتی اور ہیتی حوالے سے اردو ادب کو انفرادیت اور وسعت عطا کی۔ ہر دو اصناف نے گزشتہ صدی کے اثرات کو اپنے تجربات اور اظہار کا حصہ بنایا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں رومانیت نے اردو نظم و غزل کا دامن تاریخی واقعات، تلمیحات اور علامات سے بھر دیا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک نے ادب سے وابستگی اختیار کی تو اس موڑ پر ہمیں بیک وقت رومانی اور ترقی پسند ذہن رکھنے والے شعرا نظر آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی کے ہاں ہمیں تاریخی اور واقعاتی تلمیحات کی وسیع دنیا آباد ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں کچھ ایسے شعرا سامنے آئے جو کسی بھی تحریک یا گروہ سے وابستہ نہیں تھے مگر انھوں نے نظم کے میدان میں ہیت اور موضوع کے اعتبار سے کچھ منفرد شاعری کی جس نے ان کے نام کو آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔ ان شعرا میں تصدق حسین خالد، ن۔م۔راشد، میراجی، مجید امجد اور اختر الایمان کے نام شامل ہیں۔ ان شعرا کے ہاں موضوعات کی وسعت نے ہیتی تجربات کے ساتھ مل کر قاری کو ایک ایسی دنیا سے روشناس کرایا جو اس سے پہلے بالخصوص اردو نظم کا حصہ نہیں تھی۔ ان شعرا کے ہاں تاریخی حوالے جدت اور انفرادیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ تصدق حسین خالد اور ن۔م۔راشد کی نظموں سے ایک ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

عیش کیخسروی و طنطنۂ فغفوری
کہیں پرویز کے حیلے، کہیں چنگیز کے ظلم،
کہیں شبیری و ابراہیمی
راز ہی راز ہے حیرت کدۂ بزمِ نمود
تم چمن زار ہو فطرت کے قریں رہتے ہو
یہ تماشا گہہ عالم کیا ہے

(یہ تماشا گہہ عالم کیا ہے)(۱۲)

گیاہ و سبزہ و گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقار زیر پر
تو سرمہ در گلو انساں

سلیماں سر بزانو اور سبا ویران!

(سبا ویران) (۱۳)

میراجی اور منیر نیازی کے بعد تلمیحاتی علامات کو اپنی شاعری کا حصہ بنانے میں جیلانی کامران، افتخار عارف، سہیل احمد خان، سلیم الرحمٰن، ناصر شہزاد اور عبدالعزیز خالد کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ ان شعرا کے ہاں تلمیحات خلوص اور انفرادیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

تقسیم برعظیم پاک و ہند کے بعد سقوطِ ڈھاکا کے سانحے نے ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا۔ چناں چہ ثروت حسین، غلام حسین ساجد اور معین نظامی کے ہاں تلمیحاتی حوالے منفرد انداز سے برتے گئے ہیں۔ ان شعرا نے تاریخ اور تہذیب سے علامتیں اخذ کی ہیں۔

جہاں تک اس تاثر کا تعلق ہے کہ تلمیحات کے مطالعہ سے قاری قدامت پسندی، ماضی پرستی یا کہنہ روایات میں کھو کر ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ تلمیحات کا اختراعی عمل ایسا نہیں کہ جس سے زبان محدود ہو جائے، بلکہ اس لسانی سانچے سے زبان میں بلاغت کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ لسانی سانچے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مفرد لفظ کا مطلب اکثر ادھورا ہوتا ہے بلکہ بامعانی مفرد الفاظ تو زبان کا مختصر ترین حصہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے لفظ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہ ذاتِ خود ایک ''اشارہ'' ہے۔ اگر اردو زبان کا اس خاص حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے عقاید، توہمات اور دیوتاؤں کے قصوں کے لیے بھی تلمیحات وضع کی گئی ہیں۔ اخذ و اکتساب کے اس عمل سے اردو زبان کی وسعت اور جامعیت میں اضافہ ہوا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ مولوی سید وحید الدین سلیم۔ افاداتِ سلیم (مرتب: محمد سردار علی)۔ حیدر آباد دکن: کتب خانہ مسجد چوک، س ن، ص۱۲۶

۲۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان۔ علامتوں کے چشمے، مشمولہ مجموعہ سہیل احمد خان۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص۱۴

۳۔ سبطِ حسن۔ ماضی کے مزار۔ کراچی: دانیال، ۱۹۸۷ء، ص۳۱۴

۴۔ ایضاً، ص۳۲۰

۵۔ مجید امجد۔ کلیاتِ مجید امجد (مرتب: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)۔ لاہور: ماورا پبلشرز، طبع دوم، ۱۹۹۱ء، ص۱۸۲

۶۔ قاضی عبدالقدوس عرشی ڈبائیوی۔ اردو تلمیحات و اصطلاحات۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص۳۱

۷۔ غلام حسین ساجد۔ کتاب صبح۔ لاہور: سارنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۸۱

۸۔ ظفر اقبال۔ اب تک، جلد اوّل۔ لاہور: ملٹی میڈیا افیرز، ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۴
۹۔ حفیظ جالندھری۔ کلیاتِ حفیظ جالندھری (مرتب: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۳
۱۰۔ انتظار حسین۔ علامتوں کا زوال۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴
۱۱۔ جعفر طاہر۔ ہفت کشور۔ کراچی: پاکستان رائٹرز گلڈ، ۱۹۶۲ء
۱۲۔ ڈاکٹر تصدق حسین خالد۔ سرودِ نو۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۲
۱۳۔ ن۔م۔راشد۔ کلیاتِ راشد۔ لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۸